اُن کے نام جو مجھ سے محبت کرتے ہیں

اور

اُن کے نام جن سے مجھے محبت ہے

منوّر لکھنوی

چند الفاظ

یوں تو اب میری غزلگوئی کی عمر قریب قریب نصف صدی ہو چکی ہے۔ لیکن 'نوائے کفر' میری غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ بہت مختصر ہے۔ غزلیں منتخب ہیں اور ان کے اشعار بھی منتخب۔ انتخاب راج نرائن رازؔ نے کیا ہے اور مجموعے کی ترتیب دینے والے بھی وہی ہیں۔ مشورے نریندر نشچل اور بلراج حیرتؔ کے بھی شامل ہیں۔

میں اپنی غزل کو "برائے یارانِ من سنداست" قطعاً نہیں کہنا چاہتا۔ تاہم مجھے "اُن بزعمِ خود مزاج دانانِ غزل" کے "فہم و مذاق" پہ تعجب ضرور ہوتا ہے جو غزل کے موضوع پر قلم تو اُٹھاتے ہیں لیکن "چار درویشوں" کے تذکرے سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ میری غزل میں، میرے اندازِ فکر میں روایتی قدروں سے گریز یا بغاوت یقیناً نہیں ہے۔ لیکن کیا ایسا کئے بغیر کسی فنکار کے لئے صاحبِ طرز ہونا اور اچھا ادب تخلیق کرنا ناممکن ہے؟ اس سوال کا جواب کوئی دیانتدار نقّاد، کوئی ذہین قاری ہی دے سکتا ہے۔

میرے جن عزیزوں اور دوستوں نے 'نوائے کفر' کی اشاعت میں عملی دلچسپی لی ہے
میں اُن کا تہہ دل سے ممنون ہوں ۔ ان حضرات کے ناموں کا اعلان کرنے کی مجھے
اجازت نہیں ہے ۔

میری غزلیات کا ایک اور انتخاب "ادائے کفر" کے نام سے جلد ہی شائع ہونیوالا ہے۔

منوّر لکھنوی

۲۵ نومبر، ۱۹۶۱ء

فیض گنج، دریا گنج، دہلی

"غزل اور منوّر"

اردو غزل ایک متنازعہ فیہ صنفِ سخن ہے۔ اس کے حق میں اور اس کے خلاف بہت کچھ کہا، سُنا اور لکھا گیا ہے۔ اور ابھی بہت کچھ کہا، سُنا اور لکھا جائے گا۔ معترضین نے غزل پر بڑے آڑے اور اوچھے وار کئے ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اسے "غیر فطری" یا "نیم وحشی" صنفِ سخن کہنا، ادب کے منصب، ادب کے تمثالی پیرائے اور ادب کی رمزیت سے کلیتاً انکار کرنا اور اس کے افادی نہ ہونے پر زور دینا زیادتی کرنا ہے۔ کسی بھی ملک کا سرمایہ اس کے فنونِ لطیفہ نہیں بلکہ سستے تجارتی نسخے، کم لاگت پر مصنوعات تیار کرنے کے سلسلے کی معلومات اور کلیں کارخانے ہوتے ہیں۔ ادب دھان اگانے، لپ اسٹک بنانے اور موٹریں تیار کرنے کا فن نہیں۔ ادب دھنک کے نظر نواز رنگ ہیں جن کی خوبصورتی اور دلکشی خونِ جگر سے مستعار ہے۔

ادب زندگی کا آئینہ نہیں، آئینہ خانہ ہے۔ ایک مغربی مُصنّف کا قول ہے "تاریخ میں سوائے ناموں کے کچھ سچ اور ادب میں سوائے ناموں کے کچھ جھوٹ نہیں ہوتا۔" اس قول کے دوسرے حصّے سے انکار مشکل ہے۔ پروفیسر ہڈسن نے جو بات عظیم شاعری کے ضمن میں کہی ہے، وہی بڑی آسانی کے ساتھ عظیم ادب کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے، یعنی عظیم ادب "زندگی سے ہے، زندگی کا ہے اور زندگی کے لئے ہے"۔ ادب کے آئینہ خانے میں زندگی کے روپ کروپ بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہر آئینے میں زندگی کا عکس مختلف اور جدا گانہ ہوتا ہے۔ یوں کہ تلوّن انسانی مزاج کا خاصہ اور تنوّع خواہش ہے۔ ذہن لمحے بھر میں کڑے کوسوں کے فاصلے طے کرلیتا ہے۔ اور موڈ یعنی مزاج کی کیفیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ جب تلوّن اور تنوّع انسانی مزاج کی اساس ہوں تو غزل بے چاری کو کیوں کر مطعون قرار دیا جاسکتا ہے، جس کے ہر شعر میں

ایک الگ دُنیا آباد ہوتی ہے۔

فرانسیسی ادب میں ایک دَور وہ بھی گزرا ہے، جب تمثیل نگاروں نے کم سے کم الفاظ — ایک مصرع — ایک لفظ میں مکمل نظم کہنے کو فن کی معراج سمجھا ہے۔ اختصار کو ادب ہی میں نہیں مصوری میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ فرینک رُٹر "اے وولوشن اِن ماڈرن آرٹ" (ماڈرن آرٹ کا ارتقا) میں لکھتا ہے۔ "موقلم کی کم سے کم جنبشوں سے زیادہ سے زیادہ بات کو نمایاں کرنا ایک شرف ہے، ایک سعادت ہے جس کی خواہش ہر فنکار کو ہونا چاہیئے"۔ ہمارے ادب میں یہ سعادت غزل کے حصے میں آئی ہے۔

ایجاز میں جو حُسن ہے وہ اکثر اطناب میں نہیں ہوتا۔ ایجاز بجائے خود اعجاز ہے اور اگر ایجاز میں اطناب پیدا ہو جائے تو دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ اور اردو غزل دو آتشہ ہے۔

بقولِ ڈاکٹر تاثیر غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو "فیضان کی جستہ جستہ، پارہ پارہ آتی جاتی اُڑانوں یا یوں، کہیئے کہ ایکا ایکی لپک اُٹھنے والی جھلکیوں کی متحمل ہے اور شعور و احساس کی لہروں کو ایک بہتی ہوئی ندی کے روپ میں ڈھال دیتی ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک ہی تاثر کا آئینہ دار ہوتا ہے، جس کو گوناگوں، پریشان، درہم برہم احساسات اور ارتسامات کے طومار سے منتخب کر لیا جاتا ہے۔ اس میں جمالیاتی تجربے کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے جس سے شدت پیدا ہونا لازم ہے"۔

یہاں "جس کو گوناگوں، پریشان، درہم برہم احساسات اور ارتسامات کے طومار سے منتخب کر لیا جاتا ہے" کے الفاظ خاص توجہ چاہتے ہیں۔

غزل کا عمل مشینی ہے غزل مشینی نہیں۔ انتخاب کے عمل میں جو ندرت، جمالیاتی تجربے کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے پر توجہ مرکوز کرنے سے جو شدت اور آواز و الفاظ کی تکرار سے جو موسیقی پیدا ہوتی ہے، وہی غزل کو افسانہ و افسوں بنائے ہوئے ہے۔ انہیں عناصر کے طفیل قدامت کے باوجود یہ صنفِ سخن پُرانی نہیں ہوئی۔ اردو ادب میں اسے آج

بھی وہی مرتبہ اور مقبولیت حاصل ہے جو اسے متقدمین، متوسطین اور متاخرین مشاہیرِ متغزلین کے عہد میں حاصل تھی۔

غزل نے بُرے دن بھی دیکھے۔ حالیؔ کی ہمدردی کام آئی۔ حالیؔ نے اس بے وقت کی راگنی میں جو اصلاح چاہی وہ اُن کے اپنے عہد میں تو کچھ زیادہ رواج نہ پا سکی لیکن بعد کے شعراء نے بدلے ہوئے حالات میں حالیؔ کی قدر وقیمت پہچانی اور غزل کو نئی زندگی دی۔ غزل میں جو نئی آوازیں اُبھریں اور بہت مقبول ہوئیں وہ فانیؔ، اصغرؔ، حسرتؔ، جگرؔ، یگانہؔ اور فراقؔ کی ہیں۔ فانیؔ نے غزل کو سوز وگداز، اصغرؔ نے طہارت، حسرتؔ نے زندگی کی گرمی وپاکی اور جگرؔ نے سرمستی و رندی عطا کی ہے۔ یگانہؔ نے اسے ایک خاص انا بخشی اور فراقؔ نے اسے ایک کیف آور جمالیاتی رنگ روپ دینے کی سعی کی ہے۔ ان آوازوں کے ساتھ ساتھ متعدد اور آوازیں بھی اُبھریں۔ بعض گونجنے والے مل گئے اور بعض اپنے بلند آہنگ اور اپنی انفرادیت کے باوجود کم سماعت میں آئیں۔ ایسی ہی ایک آواز منشی بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی کی ہے۔

بقول ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ "منورؔ ہندوستان کا بہترین نظم باف ہے"۔ ڈاکٹر موصوف کی رائے سے اتفاق یا اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ پچاس برس کی شعری عمر میں منورؔ کی غزلیات کا ایک مجموعہ بھی شائع نہیں ہوا۔ اس کی مطبوعہ تصانیف میں نظموں کا مجموعہ "کائنات دل"، "گیتا کا منظوم ترجمہ" نسیم عرفان"، "مہاتما بدھ کے فرمودات" "دھمپد" کالی داس کی تصنیف "کمار سمبھو" کا منظوم ترجمہ اور حافظ کے اشعار کا منظوم ترجمہ "وجدانِ حافظ" شامل ہیں۔

"نوائے کفر" منورؔ کی غزلیات کا پہلا مجموعہ ہے۔ غزل بڑی دھان پان صنفِ سخن ہے یوں تو اس میں ہر قسم کے جذبات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سپاٹ خیالات اور سپاٹ طرزِ ادا اس کے مزاج سے میل نہیں کھاتے۔ غزل جس درجہ آسان صنفِ سخن ہے، اسی درجہ

مشکل اور دشوار بھی ہے۔ وہ یوں کہ مواد اور ہیئت اور ہیئت اور مواد میں جو نازک رشتہ ہے وہ غزل کے معاملے میں اور بھی نازک ہو جاتا ہے۔ اور جو غزل کے بنانے میں نہیں غزل کے ہو جانے ہی میں قائم رہ پاتا ہے۔ ایک کیفیت شاعر پر گزری، اس نے اختصار سے کام لیا تو ایک شعر ہو گیا اور اگر اس یا اس جیسی کیفیت کے زیرِ اثر کچھ کہنے کی سعادت ملی تو غزل ہو گئی۔ اور اگر شاعر نے شعوری کوشش سے ردیف و قوافی کو سامنے رکھ کر شعر کہے تو وہ مواد اور ہیئت کے نازک رشتے کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھ پائے گا۔ ایسی صورت میں ایک نقص اور بھی پیدا ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ شاعر کی فکر ردیف و قوافی اور الفاظ کے تابع ہو جاتی ہے شاعر قوتِ بیان سے خیالات میں بے ساختگی تو پیدا کر سکتا ہے لیکن اشعار کو تازگی نہیں دے سکتا۔ یہ ردیف اور قوافی کی غلامی کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ چند مستثنیات سے قطع نظر ہم نے غزل کے ہر دور میں ایک بے کیف یکسانیت محسوس کی ہے۔ غزل ہمیں اکثر نگلے اور اُگلے ہوئے نوالے دکھائی پڑی ہے اور آج بھی ہم کچھ اسی طرح محسوس کرتے ہیں۔ اس امر میں غزل کی بعض ان دیرینہ قدروں یا یوں کہیئے کہ بعض روایات کو بڑا دخل حاصل ہے جو غزل کا مزاج ہو گئی ہیں اور جنھیں غلط یا صحیح طور پر قبولِ عام کی سند مل گئی ہے۔ تقلید اشخاص کی ہو، الفاظ کی ہو یا روایات کی تخلیق کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتی۔

منور کی غزل تقلید اور تکرار کے اجزا سے یکسر خالی نہیں لیکن اکثر اس کی غزل میں تازگی اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔

منور کی غزلوں کے مطالعے میں جو چیز ہمیں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ منور کا نکھرا ستھرا ذوق ہے۔ میں نے لفظ ذوق کو یہاں اس کے وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ میری مراد ذوقِ نظر، ذوقِ حسن، ذوقِ عشق، ذوقِ فن اور ذوقِ حیات سے ہے۔ منور کے ہاں سطحیت نام کو نہیں۔ حسن کے انتخاب میں اس کے ذوقِ نظر نے اسے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ حسن کے باب میں وہ عاشق ہے، بوالہوس

نہیں۔ وہ محبوب کے سراپا کا ذکر تو کرتا ہے، لیکن حسیاتی نہیں۔ اس کے اشعار ہمارے جمالیاتی ذوق کی تسکین تو کرتے ہیں، لیکن احساس میں ایک عجیب بے نام سی تشنگی چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کے محسوسات یکسر نئے نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ منوّر یا کسی دوسرے شاعر سے اس کی توقع کرنا خود اپنے حالات اور ماحول سے آنکھیں چرانا ہے۔ دُنیا کے گوشے ہر لحظہ سمٹتے جا رہے ہیں۔ بساطِ عالم ہے کہ ہر آن مختصر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ کوئی واقعہ یورپ میں ہوتا ہے تو اس کے اثرات ہم یہاں محسوس کرتے ہیں یہ امر بالکل ایسے ہی ہے جیسے درد تو پیر کی چھوٹی انگلی میں ہے لیکن اس درد کو دل، دماغ، آنکھیں اور غرضیکہ جسم کے دوسرے اعضاء بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شاعر کی بصیرت اور بصارت غیر معمولی ہوتی ہے لیکن یہ سعادتیں علم کی بدولت غیر شاعروں کے حصے میں بھی آسکتی ہیں۔ علم کی حدیں ہیں کہ ماوراء سے بھی اُدھر نکلتی جا رہی ہیں۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ کوئی شاعر بھی یکسر نیا نہیں ہو سکتا۔ ایک عام انسان کی نسبت شاعر کو فطرتِ انسانی کا علم زیادہ ہوتا ہے۔ وہ زندگی، اشخاص اور اشیاء کے تعلق کو ایک نئے زاویئے سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا اور زندگی کو سراور بسر کرنے کا حوصلہ پیدا کر سکتا ہے۔[1] اس امر کی بعض عمدہ مثالیں آپ کو منوّر کے ہاں مل جائیں گی۔

آیئے آگے بڑھیں اور منوّر کی غزل کے بعض اہم پہلوؤں پر ایک نظر کریں۔

مذہب مشرقی مزاج کا جزوِ ترکیبی اور تصوف مشرقی شاعری کی میراث ہے۔ منوّر کی شاعری بھی اس میراث سے محروم نہیں۔ منوّر نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، وہاں رام بھگتی

---

[1] مرے خیال سے پیدا ہیں گلستاں کتنے — مرے قیاس نے صحرا بنائے ہیں کیا کیا
ہر شرط ہم نے تا دمِ آخر نباہ دی — صد شکر زندگی سے پشیماں نہیں ہے
آسمانوں میں بھی ہلچل سی نظر آتی ہے — ہاتھ اُٹھائے ہیں جو قسمت کو بدلنے کے لئے

کا چرچا اکثر رہتا تھا اور دیو بانیوں کی گونج بیشتر سنائی دیتی تھی۔ منوّر نے مذہب سے محض خدا پرستی ہی نہیں، انسان دوستی بھی سیکھی ہے۔ اس نے مذہب سے بیر نہیں سیکھا۔ اپنے عقیدوں کا احترام کرنا اور دوسروں کے عقیدوں کو احترام کی نظر سے دیکھنا اس کا شیوۂ خاص ہے۔ اس کے اس نہج کے نظریات کی تشکیل میں مذہبی رجحانات ہی نہیں، سیاسی اور سماجی عناصر بھی کارفرما رہے ہیں۔ منوّر کے مشرب[51] میں بڑی وسعت ہے۔ وہ "دیر و کعبہ کی، کلیسا کی ضرورت" محسوس نہیں کرتا۔ وہ بلا تعصب ہر کام کی شئے کو آنکھوں سے لگاتا ہے۔ اپنے ماحول سے برتری اور اپنی معذوریوں سے سربلندی ہی میں انسان کی عظمت ہے۔ عظمتِ انسان کا منوّر کو اس درجہ احساس ہے کہ وہ "جبین قضا و قدر" پر بل گوارا نہیں کرتا اور کرم بھی ایک حد مقرر میں چاہتا ہے۔ وہ[52] ہر شخص کے فروغ میں اپنا فروغ سمجھتا ہے۔ اس کا غم دُنیا کا غم اور دُنیا کا غم اس کا غم ہے۔ منوّر کے اس نوعیت کے محسوسات، جذبات و نظریات کی ترجمانی اس کی غزل بخوبی کرتی ہے۔

منوّر کی غزل کے مطالعے میں جو دوسری چیز ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ اس کی محرومی و ناکامی ہے۔ زمانے کی ناقدری کا فنکاروں کو اکثر شکوہ رہا ہے۔ اور بیشتر صورتوں میں تو انہیں بڑے نامساعد حالات میں فکرِ فن کرنا پڑی ہے۔ اول تو ادب کو زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا، دوم ذاتی زخموں کی ٹیسیں کائناتی بھی ہوتی ہیں۔ محرومیاں اور ناکامیاں انسانوں کا مشترکہ سرمایہ ہیں اور پھر عام نفسیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ طربیہ کی نسبت

---

51 کاش تم اس کا فیصلہ میرے ہی دِل پہ چھوڑ دو — کس کی میں بندگی کروں، کون مرا خدا بنے

ملتیں یوں نہ اُڑاتیں کبھی ایماں کا مذاق — دیر و کعبہ کی، کلیسا کی ضرورت کیا تھی

وہ خواہ مینا ہو خواہ ساغر، خواہ قرآں ہو خواہ منبر — لگائیں گے اس کو چشم و سر سے جو شئے ہیں کام کی ملے گی

52 تھا جرم کسی کا بھی اے دیدۂ شائستہ — لیکن مجھے اپنی ہی تقصیر نظر آئی

حزنیہ کیفیتیں دل کو زیادہ متاثر کرتی ہیں اور ذہنی کیفیت کا ایک عالم وہ بھی ہے جب آدمی مسرت کے لمحوں میں اداس ہو جاتا ہے اور عیش و نشاط سے گھبرا کر غموں کا دامن تھام لیتا ہے۔

منورؔ کی محرومی و ناکامی فکر و احساس کو جھلسنے والا تیز شعلہ نہیں۔ دھیمی دھیمی حیات افروز آنچ ہے۔ اس میں تلواروں کے کاری وار نہیں، نشتروں کی کھٹک ہے۔ منورؔ کی محرومیاں مایوسیاں مختلف النوع ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ دو دن کی زندگی میں "فکر معاش، عشق بتاں، یادِ رفتگاں" کے بکھیڑے ہی نہیں کئی الجھنیں (conflicts) اور بھی ہیں۔ یہی الجھنیں ہی آنی جانی اداسیاں منورؔ کی غزل میں نمایاں ہیں۔

منورؔ نے اپنے انفرادی انداز سے اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی ماحول پر سبک پیرائے میں تبصرہ کیا ہے۔ یہ تبصرے سیاسیات، سماجیات اور اقتصادیات کے کسی ماہر کے نہیں ایک دردمند دل رکھنے والے انسان کے ہیں اور چونکہ دل سے نکلے ہیں اس لئے دل میں جگہ کر لیتے ہیں۔ منورؔ نے اپنے نظریات میں کوئی بنیادی تبدیلی کئے بغیر، بدلے ہوئے ماحول کی صالح قدروں سے مفاہمت کی ہے۔ لیکن وہ ہوا کا رخ دیکھ کر بات نہیں کرتا۔ اس کے مزاج میں استدلال اور کسی قدر استقلال ہے اور اِسی کے صدقے وہ نگاہِ دہر میں نامعتبر ہونا پسند نہیں کرتا۔ یہ منورؔ کی ہوشمندی ہے کہ اُس نے اپنے سماج کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر بھرپور طنز کی ہے۔ اُس کی طنز میں تلخی نہیں، یہ طنز واقعتاً دلکشا ہے۔ اس ذیل میں منورؔ

۱۔ کیا جانے کس سوال کا پایا ہے کیا جواب ‌ ‌ ‌ آنسو بھرے ہیں دیدۂ امیدوار میں
قیامت ہے اس انگارے کا بجھ کر راکھ ہو جانا ‌ ‌ ‌ دلِ ناکام کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی

۲۔ بہار کی یہ روش کیا ہے، یہ چلن کیا ہے ‌ ‌ ‌ چمن میں ضبطِ گلوں سے ہنسی نہیں ہوتی
سلوکِ برق کے قربان آشیاں والے ‌ ‌ ‌ تباہ ہو کے بھی شعلوں نے روشنی دی ہے
جھلس کر دورِ نو کی روشنی سے کھوؤں کیوں آنکھیں ‌ ‌ ‌ مرے حق میں ہے اک نعمت منورؔ تیرگی میری

کی عجیب فراخدلی بھی ہیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ وہ سماج کو خود سے الگ نہیں سمجھتا اور اگر وہ اس کی کوئی برائی، کوئی خامی سامنے لانا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو مخاطب کرلیتا ہے، یا یوں کہیے کہ منور اپنی ذات کے آئینے میں دید و شنید کی دنیا پر نظر کرتا ہے۔

منور کی غزل کی ایک خصوصیت اس کی ہندستانیت ہے[۵۱]۔ اس ایرانی صنفِ سخن کا مزاج ابتدا ہی سے ہندستانی رہا ہے اور بعض ادوار کو چھوڑ کر ہندستانیت کی یہ لہر ہماری ساری شاعری میں جاری اور ساری ہے۔ اس کی عمدہ مثالیں قدما میں قلی قطب شاہ، ولی میر، مصحفی، نظیر اور دورِ حاضر کے بیشتر اچھے شاعروں کے ہاں ملتی ہیں۔ لیکن ہند دیومالا اور فلسفے کے جتنے پہلو منور کی غزلوں میں بار پا گئے ہیں۔ اس کی مثال ہیں شاید ہی کسی اور شاعر کے یہاں ملے۔ اس کی غزل میں جہاں ہیں ایرانی، عربی تلمیحیں، استعارے اور تشبیہیں ملتی ہیں وہاں رادھا، جمنا، نل دمن، کرشن کنہیا، کالی ناگ، گلال، پھاگ، سداما کے تندل، بنسی کی تان، پدر کا ساگ، گنگا جل، دیپک راگ، کھٹ راگ وغیرہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ بعض بعض موقعوں پر ہندی بحروں کے انتخاب نے ہندستانیت کے تاثر کو اور بھی تقویت دے دی ہے۔

منور کی بیشتر غزلیہ شاعری Emotions recollected in tranquility[۵۲] ہے۔ اُن کے ہاں جذبات کا تیز و تند طوفان نہیں، ہیجان نہیں، لیکن جذباتی[۵۳] اضطراب ہے۔ وہ

---

۵۱ تاثرات کی رادھا کا عکس پڑنے سے — تخیلات کی جمنا حسین ہے کتنی
میرے سر پہ رکھ کر پاؤں تان چھیڑے بنسی کی تان — کرشن کنھیا تم ہو اگر، کیا میں کالی ناگ نہیں

۵۲ ورڈز ورتھ

۵۳ اِن سے مرے مزاج کی آسودگی نہیں — کھلنے کو پھول لاکھ کھلے ہیں بہار میں
کارفرمائی معمارِ تخیل کیا ہے — کوئی تعمیر در و بام سے آگے نہ بڑھی

بیشتر ہمہ تن سوال بن جاتا ہے۔ منوّر اپنے جذبات کے اظہار کے لئے جو علامتیں منتخب کرتا ہے وہ نہ کل پرانی تھیں، نہ آج پرانی ہیں اور نہ کل پرانی ہوں گی۔ یا یوں کہیئے کہ روایتی علامتوں کے انفرادی استعمال سے منوّر نے بڑے تازہ کار اثرات پیدا کئے ہیں۔ اس کی نظر باریک بیں ہے مشاہدہ دیدنی ہے۔ اکثر اس کا لب و لہجہ مشاہدے اور کیفیت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ اپنی بات جس طرح کہنا چاہتا ہے اسی طرح کہتا ہے۔ اسے بیان پر عبور حاصل ہے۔ وہ الفاظ کا نبّاض ہے۔ یہی عناصر شدتِ احساس پہ دال ہیں۔ اس کے لہجے میں جو دھیما پن، اعتدال اور شائستگی میں جو سلامت روی ہے، اس کا خمیر خود اس کے اپنے مزاج سے اُٹھا ہے، اس کے جذبات میں ٹھہراؤ ہے۔ اس کی فکر منطقی ہے۔ محرومی نے اسے موت سے پیار کرنا نہیں سکھایا۔ وہ زندگی سے دامن کشاں کبھی نہیں گزرا۔ بدلے ہوئے حالات میں منوّر نے خود کو بھلے ہی غلط زمانے میں محسوس کیا ہو، لیکن زندگی نہ کرنے کا ذکر کبھی اس کے لبوں پر نہیں آیا۔ اس کی رجائیت بُجھی بُجھی سہی اختیاری نہیں یہ اس کے مزاج کا حصّہ ہے۔

"شاعری[1] سب کچھ ہے، وہ غیر مرئی اور غیر محسوس کو دیکھ سکتی ہے۔ جس کی تشریح و تفسیر ممکن نہیں، اس کی تشریح و تفسیر کر سکتی ہے۔ پتھروں کو زبان دے سکتی ہے۔ اتھاہ گہرائیوں میں جھانک سکتی ہے اور ازل و ابد کی وسعتوں کو ناپ سکتی ہے۔" منوّر کے ہاں آپ کو اس کی عمدہ مثالیں مل جائیں گی۔

منوّر کی غزل میں جدت، تشبیہوں اور ترکیبوں میں ندرت ہے۔ الفاظ میں موسیقی اور اسلوب میں ایک نیا پن ہے۔ غزل بجائے خود انجذاب توجہ کی خصوصیات کی حامل ہے۔ منوّر کی غزل میں آپ کو لفظ و معنی کی ایک نئی دُنیا آباد ملے گی۔

راج نرائن راز

---

[1] جابریل دانیوزیو



بتاؤں کیا کہ غرض کیا سفر میں رکھتا ہوں
یہی بہت ہے کہ منزل نظر میں رکھتا ہوں

مری حیات کا، میری بقا کا ضامن ہے
وہ ایک درد جو پیہم جگر میں رکھتا ہوں

سُبک نگاہ نہیں میرے مول سے واقف
بہت گراں ہے وہ سودا جو سر میں رکھتا ہوں

مری روش سے سمجھ لے نہ کوئی غیر مجھے
سنبھل کے پاؤں خود اپنے ہی گھر میں رکھتا ہوں

ابھی سلیقۂ تعمیر خام ہے شاید
ابھی یقین میں دیوار و در میں رکھتا ہوں

یہ اور بات ہے لیتا ہوں اپنے پاؤں سے کام
میں اعتقاد مگر راہبر میں رکھتا ہوں

مآلِ کار کی اب شکل دیکھئے کیا ہو
جنوں کا ہاتھ کفِ چارہ گر میں رکھتا ہوں
نگاہ میں ہے منوّر ہر اک نشیب و فراز
سنبھل سنبھل کے قدم رہگزر میں رکھتا ہوں



یہی ہے دل کے تقاضوں کا ختم ہو جانا
کسی کا خواب میں بیدار ہو کے سو جانا

مری فنا میں ہے دریا کی آرزو مضمر
تم اپنے ہاتھ سے کشتی مری ڈبو جانا

گہر کی آب تو پائی مگر گہر نہ بنا
مآلِ قطرۂ شبنم یہ آکے رو جانا

نہیں محال تجھے زندگی میں پالینا
مگر ہے شرط تری جستجو میں کھو جانا

ذرا سنبھل کے منوّرؔ ہے مرحلہ نازک
خودی کے جوش میں آکر خدا نہ ہو جانا



جُنوں خفا ہے، کشیدہ ہے آگہی مجھ سے
ہر ایک چیز مُقدّر نے چھین لی مجھ سے

خدا کی شان بتاتے ہیں تیرہ دل مجھ کو
وہی چراغ جو لیتے تھے روشنی مجھ سے

ستم ظریفیِ تقدیر تو کوئی دیکھے
جو دل شِکن ہیں وہ کرتے ہیں دل لگی مجھ سے

سُنائی دے نہیں سکتی وہاں مری آواز
چلی گئی ہے بہت دُور زندگی مجھ سے

میں آج ہوں نگہِ التفات سے محروم
کہاں گئے وہ! جو رکھتے تھے دوستی مجھ سے

سرِ نیاز کسی آستاں پہ کیا جُھکتا
نہ ہو سکی کبھی اپنی بھی بندگی مجھ سے
بہت سنبھال کے پھولوں پہ ہاتھ رکھتا ہوں
چمن میں ٹوٹ نہ جائے کوئی کلی مجھ سے



کیا سحر ہے، اعجاز ہے میں جھوم رہا ہوں
تو مستِ مے ناز ہے میں جھوم رہا ہوں
کیا زمزمۂ ساز ہے میں جھوم رہا ہوں
کس مست کی آواز ہے میں جھوم رہا ہوں
یہ کس کے ترنّم میں ہے مستیٔ مئے ناب
دل گوش بر آواز ہے میں جھوم رہا ہوں
ہر ذرّہ مرے ساتھ ہے اس رقص میں شامل
دُنیا نظر انداز ہے میں جھوم رہا ہوں
میخانے کے اسرار چھُپائے نہیں چھپتے
مستی مری غمّاز ہے میں جھوم رہا ہوں
دشوار ہے خود میرے لئے نشّے کی تشریح
اِس میں بھی کوئی راز ہے میں جھوم رہا ہوں

اندر مجھے جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے
مے خانے کا در باز ہے میں جھُوم رہا ہوں
کچھ بس نہیں ظالم کی ترنگوں سے منوّر
دل شعبدہ پرداز ہے میں جھُوم رہا ہوں



سر سے ہوائے عالمِ فانی چلی گئی
میں جس سے تھا سبک وہ گرانی چلی گئی

جب دل میں حوصلے تھے، اُمنگوں میں جان تھی
وہ عمر کٹ گئی وہ جوانی چلی گئی

اب ہے خیال و خواب وہ موجوں کا پیچ و تاب
دریائے زندگی سے روانی چلی گئی

ہلکی سی ٹیس بھی ہے طبیعت کو ناگوار
وہ آرزوئے دردِ نہانی چلی گئی

عمرِ رواں کو تھا مری روداد سے گریز
ظالم سُنا کے اپنی کہانی چلی گئی

پھرتے تھے جس کو روز لگائے جگر سے ہم
وہ نقش مٹ گیا وہ نشانی چلی گئی

جب سے منوّر اہلِ سخن تنگ ہیں ہوئے
وہ وسعتِ جہانِ معانی چلی گئی



مری تشنہ لبی میں میکدے کے کام آتے ہی رہتے ہیں
مری جانب مے گلگوں کے جام آتے ہی رہتے ہیں

فنا کا کیا اثر مجھ پر، بقا کا کیا اثر مجھ پر
طریقِ عشق میں ایسے مقام آتے ہی رہتے ہیں

غرض کچھ بھی ہو، ورنہ سچ تو یہ ہے ان کی جانب سے
سلام آتے ہی رہتے ہیں، پیام آتے ہی رہتے ہیں

نہیں معلوم یہ کیسی کشش ہے دانے دانے میں
گرفتاری کو طائر زیرِ دام آتے ہی رہتے ہیں

سرائے عالمِ امکاں کبھی خالی نہیں رہتی
مسافر آئے دن بہرِ قیام آتے ہی رہتے ہیں

طلوعِ زندگی کیا ہے، غروبِ زندگی کیا ہے
یہ منظر دیکھنے میں صبح و شام آتے ہی رہتے ہیں
کسی کو میری مدہوشی پہ ناحق بدگمانی ہے
منوّر غش پہ غش مجھ کو مدام آتے ہی رہتے ہیں



دل ہجومِ آرزو کے درمیاں گُم ہو گیا
راستے کے پیچ و خم میں کارواں گُم ہو گیا
کارواں کیا گُم ہوا، سنگِ نشاں گُم ہو گیا
یہ زمیں گُم ہو گئی ، یہ آسماں گُم ہو گیا
راز کی گہرائیوں میں کیا قدم رکھے کوئی
راز کی تہہ میں جو پہنچا رازداں گُم ہو گیا
کوئی دیکھے تو ذرا اعجازِ شوقِ بندگی
ہر جبیں گُم ہو گئی، ہر آستاں گُم ہو گیا
کوئی پتّی ، پھول کوئی اپنے مرکز پر نہیں
رنگ و بو کی چپقلش میں گلستاں گُم ہو گیا
انجمن در انجمن ہوتا بھی معنی خیز تھا
اپنے جلووں میں فروغِ کہکشاں گُم ہو گیا



حُسنِ صد رنگ سے فردوس بداماں نکلا
ہم نے جس پھول کو دیکھا وہ گلستاں نکلا

بے حقیقت سی تھی ظاہر میں تو مٹھی بھر خاک
جس بگولے پہ نظر کی وہی طوفاں نکلا

تا ابد یوں ہی اسیری میں گزرنا ہے کیا
جو بھی حلقہ تھا تصوّر کا، وہ زنداں نکلا

اور کیا شے ہے یہ معراجِ محبّت کے سوا
آرزو آپ کی ہو کر مرا ارماں نکلا

مرگ ساماں اِسے نااہل بتاتے ہی رہے
زندگی بخش نہایت غمِ جاناں نکلا

اشکِ خوں دیکھ کے برپا ہے سرِ راہ یہ غُل
کیا منوّر کوئی تارا سرِ مژگاں نکلا



فسانے جس سے رنگیں ہوں وہ عنواں لے کے چلتا ہوں
تصوّر میں گلستاں ہی گلستاں لے کے چلتا ہوں
خدا کے واسطے مجھ کو کہیں دھوکا نہ دے جانا
سہارا میں ترا عمرِ گریزاں لے کے چلتا ہوں
میں جب چلتا ہوں تشریحِ گلستاں کے ارادے سے
لبوں پر شوخیٔ گلہائے خنداں لے کے چلتا ہوں



مآل انگیز ہوتی ہے، نتیجہ خیز ہوتی ہے
جگر کی آگ بجھ جانے پہ بے حد تیز ہوتی ہے

بڑی لذت مجھے محسوس ہوتی ہے اذیت میں
شرابِ شوق کی تلخی شکر آمیز ہوتی ہے

یہ منظر دیکھ کر حیرت ہے کیوں وحشت پسندوں کو
جنوں کی خامشی بھی مصلحت انگیز ہوتی ہے

مدارِ بے خودی ہے میکشوں کے ظرف پر ورنہ
نظر ساقی کی جب اٹھتی ہے صہبا ریز ہوتی ہے

چمن کے راز جتنے ہیں اسی پردے سے کھلتے ہیں
خموشی گفتگوئے غنچۂ نوخیز ہوتی ہے

منوّرؔ میری توبہ ٹوٹنے پر یہ تعجب کیوں
کسی کو میکدے میں جراتِ پرہیز ہوتی ہے



چاند سورج ہیں یا ستارے ہیں
یہ خد و خال سب تمہارے ہیں
ان کی تفسیر کیا کرے کوئی
کتنے خاموش یہ اشارے ہیں
سبزہ و گُل نے کروٹیں لے کر
نقش کتنے حسیں اُبھارے ہیں
کوئی موج ان کی معتبر ہی نہیں
تنگ دریاؤں سے کنارے ہیں
رازِ مستقبلِ بہارِ چمن
بے کِھلے پھُول کتنے پیارے ہیں



میں قسمت پر اِتراتا ہوں، قسمت مجھ پر اِتراتی ہے

جب تیرا تصوّر کرتا ہوں اک مستی سی چھا جاتی ہے

ہوتا ہے دِل سبزے کا ہرا جب پاؤں چمن میں رکھتے ہو

کھِلتی ہیں کلیاں گلشن میں جب تم کو ہنسی آ جاتی ہے

جب مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں وہ، خاموش میں رہ جاتا ہوں

جو بات نکلتی ہے دل سے لب پہ آ کر رک جاتی ہے

ہے مجھ کو تعلّق روحانی ہر چیز سے بزمِ فطرت کی

اک چوٹ سی دل پر لگتی ہے جب کوئی کلی مرجھاتی ہے

کچھ اک لمحات ماتم پہ رونا میرا موقوف نہیں

رو لیتا ہوں جس وقت مری رونے پہ طبیعت آتی ہے



شکستِ ظرف سے کھوئیں نہ ھم بھرم اپنا
شراب پی کے نہ بہکے کبھی قدم اپنا
کریم ہم کہیں بے دست و پا نہ ہو جائیں
بس ایک حدِّ مقرر میں رکھ کرم اپنا
یہ بل جبینِ قضا و قدر پہ کیوں آخر
بنا رہے ہیں مقدّر جو آج ھم اپنا
کسی کے چوٹ لگے اور ہم تڑپتے ہیں
بہت وسیع ہے یعنی جہانِ غم اپنا
خبر بھی ہے کہ ہیں ساحل کی کروٹیں کیا چیز
دکھائے موج زیادہ نہ پیچ و خم اپنا



جب ترے سمٹے ہوئے جلووں کو پھیلاتا ہوں میں
ایک دل میں دو جہاں کی وسعتیں پاتا ہوں میں

ہوش ہو جاتے ہیں گم، جب ہوش میں آتا ہوں میں
یاد کیا کرتا ہوں تجھ کو بھول سا جاتا ہوں میں

میری عظمت دیدنی ہے عالمِ اسباب میں
خواب تیرا ہے مگر تعبیر فرماتا ہوں میں

جانتا ہوں یہ کہ عرضِ شوق ہے توہینِ شوق
پھر بھی عرضِ شوق پر مجبور ہو جاتا ہوں میں

آئینے میں شکل آخر کیا یہ پیدا ہو گئی
تُو نظر آتا ہے اس میں یا نظر آتا ہوں میں

کچھ تری شانِ کرم کا آگیا مجھ کو خیال
ورنہ تیرے سامنے کب ہاتھ پھیلاتا ہوں میں

زندگی ہی زندگی کی ابتدا آئی نظر
زندگی کو زندگی کی انتہا پاتا ہوں میں

پاؤں اُٹھتے ہی نہیں اہلِ سفر کے ساتھ ساتھ
المدد اے جذبِ دل پیچھے رہا جاتا ہوں میں

اور کچھ اُس سے زیادہ حوصلہ کرتا ہے دل
اس کو اپنے ساتھ جتنی دُور لے جاتا ہوں میں

مرگ و ہستی باعثِ زحمت نہیں میرے لئے
کھیل ہیں یہ دو، دل اپنا جن سے بہلاتا ہوں میں

یہ بھی سچ ہے وہم کر دیتا ہے اکثر بدگماں
یہ بھی سچ ہے تیری ہستی پر یقیں لاتا ہوں میں



مُصوّر رنگ و روغن میں یہ کیوں گُم ہونے والا ہے
مُرقّع کیا کوئی محوِ تکلّم ہونے والا ہے

مرے جذبات میں برپا تلاطم ہونے والا ہے
نہیں معلوم کس کس سے تصادُم ہونے والا ہے

ندامت سے جُھکی جاتی ہیں کیوں ادراک کی آنکھیں
یقیں کس کا گرفتارِ توہّم ہونے والا ہے

بکھر جائے گا یہ جلوہ سمٹ کر عرشِ اعظم پہ
ترا خندہ ستاروں کا تبسّم ہونے والا ہے

یہ حالت ہے تو ہرگز ہوش قائم رہ نہیں سکتے
مُنوّرؔ شدّتِ جذبات میں گُم ہونے والا ہے



کیا کریں شورشِ امواج کے مارے چپ ہیں
بول سکتے نہیں دریا سے، کنارے چپ ہیں

یہ وہ عالم ہے کہ جنبش سے ہیں لب بھی معذور
شہرِ خاموش میں اللہ کے پیارے چپ ہیں

ان کے اسرار کا پردہ کسی عنواں نہ اُٹھا
کہہ دیا کیا یہ نظر نے کہ نظارے چپ ہیں

حال کھلتا ہی نہیں کچھ مرے مستقبل کا
گُنگ ہے کاتبِ تقدیر، ستارے چپ ہیں

یوں تو آنکھوں کی کوئی بات نہیں چھپ سکتی
بے زبانی کے تقاضے سے اشارے چپ ہیں

چوٹ کھائے ہوئے جو دل ہیں انھیں کیوں چھیڑو
درد سے چیخ رہے تھے ابھی بارے چپ ہیں

○

دل کی تسکیں کبھی ہوئی بھی ہے
آتشِ غم کہیں بجھی بھی ہے
سب ہیں، پھر بھی کوئی نہیں میرا
ہائے کیا چیز بے کسی بھی ہے
ہیں ادائیں جنوں کی مبہم سی
کچھ یہ رونا بھی، کچھ ہنسی بھی ہے
جس تعلق کا ذکر کرتے ہو
دشمنی بھی ہے، دوستی بھی ہے
جس میں آنکھیں ہوں دید سے معذور
تیرگی بھی ہے، روشنی بھی ہے؟
پھول ہی صرف سینہ چاک نہیں
بے کلی میں کلی کلی بھی ہے

ظلم کی داد شور و شیون بھی
ظلم کی داد خامشی بھی ہے
کروٹوں کے بغیر چین نہیں
اک عجب چیز زندگی بھی ہے
میں اُٹھا کر نگاہ کیا دیکھوں
دعوتِ دید تم نے دی بھی ہے



منظور ہر کسی کا سہارا کروں تو کیوں
احسانِ ناگوار، گوارا کروں تو کیوں

میرے لئے اسی میں حیاتِ دوام ہے
آغوشِ مدّعا سے کنارا کروں تو کیوں

ہر شخص کے فروغ سے میرا فروغ ہے
اپنا ہی خود بلند ستارا کروں تو کیوں

آنکھوں کے سامنے ہے کوئی اور ہی جہان
ارض و سما کا ان سے نظارا کروں تو کیوں

اس کے بغیر کام مرا کون بند ہے
گم گشتگی میں دل کو پکارا کروں تو کیوں

میری نظر سے خود مری منزل ہے آشکار
میں تیرے گھر کی سمت اشارا کروں تو کیوں



سلسلہ آہ کا جب بابِ اثر تک پہنچے
ہم سمجھ لیں ترے طالب ترے در تک پہنچے

حسبِ توفیق نہ معیارِ نظر تک پہنچے
جو بڑھے بھی تو فرشتے نہ بشر تک پہنچے

جوشِ وحشت میں ادب کا بھی مناسب ہے لحاظ
جوشِ وحشت ہو مگر ہاتھ نہ سر تک پہنچے

سرِ ساحل ہی لرزتا ہے سفینہ دل کا
اور چکرائے یہ کشتی جو بھنور تک پہنچے

کچھ وہ عالم تھا کہ اک گام بھی آگے نہ بڑھے
ہم پہنچنے کو تری راہگزر تک پہنچے

رکھ لیا غیرتِ ناموسِ جنوں کا پردا
نہ بیاباں سے پلٹ کر کبھی گھر تک پہنچے
جو یہ حالت ہے تو پھر باخبری کیا لازم
بے خبر کو نہ منوّر کی خبر تک پہنچے



دل خون روئے کوئی اگر چشمِ تر ملے
سینہ ہو شق، جو چاک کسی کا جگر ملے
طوفان حشر خیز اگر ہوں تو کیا عجب
دریا میں جب حباب بھی شوریدہ سر ملے
دنیائے بے ثبات کی تصویر کھنچ گئی
تارے جو ڈوبتے ہوئے وقتِ سحر ملے
ملتے ہیں بے دلی سے تو ملنا ہے کیا ضرور
سو بار ہم ملیں کوئی دل سے اگر ملے
کھلتے ہی آنکھ قوتِ پرواز چھن گئی
کیا جانے کس گھڑی تھے ہیں بال و پر ملے
پایا فنائے غنچۂ نوخیز سے سبق
یعنی ملے حیات اگر مختصر ملے



پے بہ پے در ساغرِ صہبا بریز
پیاس بجھ کر اور ہو جاتی ہے تیز

دیکھئے ہوتی ہے اب کس کو شکست
ہوں خود اپنے دل سے میں محوِ ستیز

اک نہ اک فتنے سے ہر دم سامنا
زندگی ہے کس قدر ہنگامہ خیز

کی ہے ایسی ہی روش اب اختیار
کر رہا ہوں ہر دو عالم سے گریز

ہو اگر تلخی تو پھر ناقص نہ ہو
ہاں ذرا سی، ہاں ذرا سی اور تیز

اب نہ کیا اِن بازوؤں کو دینگے زیب
عنبریں گیسو وہ اور پھر مشک بیز
دُور ہی سے پرسشِ احوالِ دل
ورنہ دھڑکن اور ہو جائے گی تیز



میرے سوا تھا اس کا سزاوار اور کون
خود میں نے مانگ کر دلِ ناکام لے لیا

اک لفظ کا بھی اب تو سمجھنا محال ہے
لینے کو ہم نے دوست کا پیغام لے لیا

رندوں کے ساتھ ہے یہی ساقی کا مشغلہ
اک جام دے دیا، کبھی اک جام لے لیا

پھر تیرگیِ راہ کے بھی پاؤں اُٹھ گئے
جب ہاتھ میں چراغ سرِ شام لے لیا

تھا بابِ کائنات پہ منظور تبصرہ
آغاز لے لیا، کبھی انجام لے لیا

جو شکل چاہتے تھے مُنوّرؔ نہ بن سکی
کچھ دل سے کچھ نگاہ سے بھی کام لے لیا



سیلِ فنا کی زد میں گو جاوداں رہے گا
ہستی کا یہ سفینہ یُوں ہی رواں رہے گا

بے چین کرنے والے بے چین ہو رہے ہیں
اب کامیاب ہو کر دردِ نہاں رہے گا

ہر چند زندگی نے لیں کروٹیں ہزاروں
خوابِ گراں یہ پھر بھی خوابِ گراں رہے گا

لینے کے واسطے تو لے لوں مقام تیرا
لیکن سوال یہ ہے پھر تو کہاں رہے گا

ممکن نہیں چمن میں دونوں کی ضد ہو پوری
یا بجلیاں رہیں گی، یا آشیاں رہے گا

موتی چھلک نہ اُٹھیں جب تک جبینِ گُل پر
شبنم کی آرزو میں ہر گلستاں رہے گا

ہو جائے گا نہ پیدا رنگِ بہار جب تک
گل خوں چکاں رہیں گے، دل خوں فشاں رہے گا

نبھنے کو نبھ رہے ہیں آئینِ رازداری
اپنا حریف بن کر خود رازداں رہے گا

پردے میں شاعری کے کیا کہہ گیا منورؔ
حیرت میں تا بہ مدت ہر نکتہ داں رہے گا



زباں پر اُن کے دل کا مُدّعا آنے نہیں دیتے
اُنہیں کے وسوسے کچھ اُن کو فرمانے نہیں دیتے

کھُلا ہے شمعِ نورانی سے یہ رازِ دروں، ورنہ
پتہ کچھ سوزشِ پنہاں کا پروانے نہیں دیتے

اُٹھا کر لے گئے سوئے لحد ہوتے ہی بند آنکھیں
تھکے ماندے مسافر کو بھی سستانے نہیں دیتے

مآل اندیش ہیں، عبرت ملی ہے موسمِ گُل سے
کسی کے غنچۂ خاطر کو مُرجھانے نہیں دیتے

گہر ہو، آئینہ ہو، سنگریزہ ہو کہ دریا ہو
کسی کی آبرو پر حرف ہم آنے نہیں دیتے

مُنوّر ہم کو ہے احساس اپنے دل کی عظمت کا
گھٹا اِس آسماں پر رنج کی چھانے نہیں دیتے



جنوں کی شرط مکمل کبھی نہیں ہوتی
جنوں کے ساتھ اگر آگہی نہیں ہوتی

کنارِ شوق سے پہلو تہی نہیں ہوتی
شریکِ ناز کبھی بے رُخی نہیں ہوتی

نظر سے کام تو میں دیکھنے کا لیتا ہوں
نظر کے سامنے صورت کوئی نہیں ہوتی

ازل سے تا بہ ابد زندگی کا رونا ہے
یہ داستاں تو کبھی ختم ہی نہیں ہوتی

تمہیں سے عکس طرازی کا فن یہ سیکھا ہے
خود آئینے سے تو صورت گری نہیں ہوتی

مرا غبار اُڑے بھی تو کیا زیاں میرا
اِس اِنتشار سے کچھ ابتری نہیں ہوتی

بہار کی یہ روش کیا ہے، یہ چلن کیا ہے!
چمن میں ضبط گلُوں سے ہنسی نہیں ہوتی

اُلٹ پلٹ کے بھی دیکھا ترے مرقع کو
کِسی بھی رُخ سے جُدا دلبری نہیں ہوتی

یہ آفتاب نہیں ہے تو اور پھر کیا ہے
چراغِ صبح میں کیا روشنی نہیں ہوتی



توقعات نے مجھ کو ہلاک کر ڈالا
تعلقات نے قصہ ہی پاک کر ڈالا
بہار کیا اِسے پھولوں سے گلزیں کرتی
بہار نے مرا دامن ہی چاک کر ڈالا
کسی کی چشمِ نگارین کے سرخ ڈوروں نے
مری رگوں کو بھی رگ ہائے تاک کر ڈالا
لگی یہ آگ کچھ اِس شکل سے کہ بجھ نہ سکی
گدازِ دل نے منور کو خاک کر ڈالا



آپ ہوں گے دلِ مشتاق سے گویا کہ نہیں
جان ہوگی کبھی تصویر میں پیدا کہ نہیں
دمِ آخر بھی مٹا نقشِ تمنّا کہ نہیں
ساتھ کچھ لے کے چلے حاصلِ دُنیا کہ نہیں
دل میں ہوگا کبھی گزر صبر و سُکوں کا کہ نہیں
آئینہ بن کے رہے گا کبھی دریا کہ نہیں
درد سا درد ترے دل میں ہے پیدا کہ نہیں
شوق نے کی بھی ہے تائیدِ تمنّا کہ نہیں
کیا حقیقت ہے تری، کیا ہے تقاضائے حیات
کبھی سوچا بھی ہے یہ بیٹھ کے تنہا کہ نہیں

ہوں وہ مایوس مُقدّر نہیں جس کو معلوم
کبھی کِھلتا بھی ہے گلزارِ تمنّا کہ نہیں

سوچتا ہوں میں یہ رہ رہ کے مُتوّرِ دل میں
بارِ حکیت و تنفر مجھ سے اُٹھے گا کہ نہیں



خود کو محیطِ کون و مکاں پا رہا ہوں میں
اِس آئینے میں صاف نظر آ رہا ہوں میں
وہ بے خودی، شوق - کہاں، اب کہاں وہ کیف
آ کر جہانِ ہوش میں پچھتا رہا ہوں میں
اب اِس کا امتیاز بھی امرِ محال ہے
آتے ہیں، وہ اِدھر کہ اُدھر جا رہا ہوں میں
یہ آسماں، زمین یہ، دوزخ یہ، یہ بہشت
کچھ بھی وہاں نہیں ہے جہاں جا رہا ہوں میں
کرنا پڑا ہے زیست کا بارِ گراں قبول
اک ناگوار فرض سے گھبرا رہا ہوں میں

از خود مرا وجود میں آنا محال تھا
کِس کی خطا تھی اور سزا پا رہا ہوں میں
یہ رقصِ کائنات مُنوّر عبث نہیں
خود سازِ دل پہ اپنی غزل گا رہا ہوں میں



قائلِ فرقِ ناگوار میری روش کبھی نہ تھی
دوست سے گو تھی دوستی، غیر سے دشمنی نہ تھی

عالمِ ہست و بود میں شکلِ مآل تھی عجیب
موت تو زندگی سے تھی موت سے زندگی نہ تھی

کچھ تو جواب دیں مجھے، بن گئے لاجواب کیوں
میرے سوال سے کبھی یہ تو مُراد ہی نہ تھی

جذبۂ غم اُبھار کر تم نے غضب ہی ڈھا دیا
واقعی سرگزشتِ دل مجھ کو تو یاد ہی نہ تھی

میری نظر میں تھی فنا، میں تھا مآل آشنا
خندۂ گل کا تھا مذاق لب پہ مرے ہنسی نہ تھی

○

لاکھ کعبے لاکھ بُت خانے لئے پھرتا ہوں میں
ایک دل میں کتنے کاشانے لئے پھرتا ہوں میں

ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے مستی کا وجود
پیش و پس کتنے ہی میخانے لئے پھرتا ہوں میں

سب کی وحشت پوچھ لیتی ہے مزاجِ آگہی
ساتھ اپنے جتنے دیوانے لئے پھرتا ہوں میں

ہے وہی ویرانہ، جس کی خاک ہو میرا غبار
ساتھ یوں تو کتنے ویرانے لئے پھرتا ہوں میں

ہے بقدرِ جذبِ دل قدرِ تعلق کا مدار
ہمرہی میں اپنے بیگانے لئے پھرتا ہوں میں

دیکھئے جا کر کہاں بُجھتی ہے ان کے دل کی آگ
جو ہیں بے پروا وہ پروانے لئے پھرتا ہوں میں

یاس بھی حسرت بھی حیرت بھی خوشی بھی رشک بھی
اک نظر میں کتنے افسانے لئے پھرتا ہوں میں



موسمِ گُل کے تصوّر میں یہ عالم ہو جائے
پتّے پتّے میں نظر رنگِ گُلستاں آئے

مُنھ سے کہنا نہ پڑے، ان پہ عیاں بھی ہو جائے
بن کے آنکھوں میں جو آنسو ہر اک ارماں آئے

کم نہیں موت سے جینے کا تقاضا ہم کو
خاک جینے کا مزا اے غمِ پنہاں آئے

دے کے ترتیبِ بہم ان کو دیا دل کا خطاب
جب ترے ہاتھ کچھ اجزائے پریشاں آئے

پتّے پتّے سے ہویدا ہوں جنُوں کے آثار
اُڑ کے گلشن میں جو کچھ خاکِ بیاباں آئے

کہیں روشن نہ ہوا نام کو بھی ایک چراغ
دہر میں ہم صفتِ شامِ غریباں آئے



عجیب کیفیتِ مسلسل مقدّرِ مے کشی ملے گی
زوال آسودگی کا ہوگا عروج پر تشنگی ملے گی

جمیل ذوقِ فنا جو ہوگا تو جانفزا موت بھی ملے گی
تجھے مبارک ہو مرنے والے کہ اک نئی زندگی ملے گی

ہزار مرکز سے متّصل ہو نہ پھر بھی ساکن کبھی ملے گی
جہاں کہیں بھی نظر ملے گی سپردِ آوارگی ملے گی

قدم چمن میں سنبھل کے رکھنا نظر اُٹھانا ذرا سمجھ کر
جتائے گی حق شگفتگی کا دمِ سحر جو کلی ملے گی

غریب ساحل سے کوئی پوچھے جو حال دریا نے کر دیا ہے
کرو گے موجوں کا جب نظارہ مزاج میں برہمی ملے گی

ہے دل کا رونا غضب کا رونا اسے چھپانا ہے سخت مشکل
ہزار آنکھیں ہوں خشک پھر بھی پلک پلک میں نمی ملے گی

وہ خواہ مینا ہو خواہ ساغر، وہ خواہ قرآں ہو خواہ منبر
لگائیں گے اس کو چشم و سر سے جو شے ہمیں کام کی ملے گی

حساب اس کا ہے کچھ انوکھا، شمار اس کا ہے کچھ نرالا
وہیں جفا کامیاب ہوگی، جہاں وفا کی کمی ملے گی

خود اعتمادی یہ کہہ رہی ہے مرے اک اک لفظ سے منوّر
مذاق نکھرے گا شاعری کا ادب کو شائستگی ملے گی

○

حدیثِ آرزو ہو ختم کیوں کر جان باقی ہے
فسانہ لاکھ فانی ہو مگر عنوان باقی ہے
ہر اک امید باقی ہے ہر اک ارمان باقی ہے
غم جاں آفریں باقی ہے جب تک جان باقی ہے
ابھی شاید تری تکمیل اے انسان باقی ہے
ابھی کچھ نیک و بد کے درمیاں پہچان باقی ہے
جو سچ پوچھو تو میں خود اس کو واضح کر نہیں سکتا
دلِ ناشاد میں مبہم سا اک ارمان باقی ہے
بہت دل مر چکا ہے خواہشیں پھر بھی نہیں جاتیں
جو دریا ہی نہیں باقی تو کیوں طوفان باقی ہے



اپنی ہستی کو معمّہ سا بنائے رکھوں
خود کو اب ذہن کے گوشوں میں چھپائے رکھوں

نہیں اُمیّد کہ شاداب ہو دل کی کھیتی
اوس پڑ جائے تو کیوں آس لگائے رکھوں

مری حسرت نہیں اغیار سے اتنی برباد
بن پڑے تو اسے اپنوں سے بچائے رکھوں

یوں تو دُنیا سے مجھے ایک بھی اُمیّد نہیں
تا بہ کے ہاتھ بہر حال اُٹھائے رکھوں

جان دیدوں یہ خوشی جان کا طالب ہو اگر
لاکھ دشمن ہو کوئی، دوست بنائے رکھوں

ہے منوّر یہی آوارگیٔ دل کا علاج
الجھنوں میں اسے ہر وقت پھنسائے رکھوں



نہ بنے کوئی بھی تدبیر تو پھر کیا کیجے
روٹھ ہی جائے جو تقدیر تو پھر کیا کیجے
رنگ و روغن نے ابھارے تو قیامت کے نقوش
ہے بے جان ہی تصویر تو پھر کیا کیجے
سِل گیا گو ترے اصرار پہ ہر زخم کا منھ
نہ ہو خاموش دلِ نخچیر تو پھر کیا کیجے
ہر دعا اپنی طرف سے تو ہے سرشارِ خلوص
اب جو پیدا نہ ہو تاثیر تو پھر کیا کیجے
عمر بھر یوں تو بہت خواب حسیں دیکھے ہیں
نہ ہوں شرمندۂ تعبیر تو پھر کیا کیجے
ہے بجا شوقِ سفر اُڑ کے ستاروں کی طرف
تیرگی ہو پسِ تنویر تو پھر کیا کیجے

لاکھ ہو دشنہ بکف پشت پہ دشمن کا سلوک
دوست بن کر ہو بغل گیر تو پھر کیا کیجے
ڈال دی ہم نے گلستاں میں نشیمن کی بنا
خام ہے جذبۂ تعمیر تو پھر کیا کیجے



تلخ ہونے پہ بھی غمِ دل کی دوا ہے تو سہی
خواہ مر مر کے ہو جینے کا مزا، ہے تو سہی

میں خدا تم کو سمجھ لوں تو بُرائی کیا ہے
کُفر یہ کیشِ محبّت میں روا ہے تو سہی

آدمی مصلحتاً خواہ یہ دعوےٰ نہ کرے
آدمی ہو کے بھی انسان، خدا ہے تو سہی

یہ نہ ہوتا تو نکھرتا نہ کبھی رنگِ بہار
ہر کلی کو گلۂ چاکِ قبا ہے تو سہی

اور بھی دام بچھانے کو بچھا لے صیّاد
ورنہ ہر مرغِ چمن رشتہ بپا ہے تو سہی

نہیں معلوم بنا دے اسے کب کون سموم
ہر روش رہ گزرِ بادِ صبا ہے تو سہی

○

نہ ہے شبنم میں، نہ گوہر میں، نہ آئینے میں
بخدا کتنی صفائی ہے مرے سینے میں

کچھ اس انداز سے پڑتا ہے جبیں کا پرتو
حرف قسمت کے نمودار ہیں آئینے میں

کیا سے کیا کر نہ دیا آپ نے آئینے کو
کیا سے کیا ہو نہ گئے آپ خود آئینے میں

کس قدر حسن کے اسرار میں گہرائی ہے
دیکھئے اور ذرا ڈوب کے آئینے میں

دسترس آپ تک اس شکل سے حاصل ہے مجھے
آئینہ ہاتھ میں ہے، آپ ہیں آئینے میں

کیجئے شوق سے آرائشِ گیسوئے جمال
نہ پڑے بال مگر ایک بھی آئینے میں

پاس رہ کر تو دکھاتے نہیں صورت اپنی
نظر آتے ہیں مگر دُور تک آئینے میں

ایک تصویر سے دونوں کو سجا رکھا ہے
میرے دل میں ہیں اِدھر اور اُدھر آئینے میں

آپ کے ہاتھ میں آیا ہے تو جاگا ہے نصیب
آب آجائے گی اب اور بھی آئینے میں

آئینہ آپ سے، معیار ہے آئینے کا
آئینہ آپ میں ہے، آپ ہیں آئینے میں

دم بخود صورتِ آئینہ مُتحیّر میں ہوں
سانس لینے سے پڑے بال نہ آئینے میں



کام کی شے ہے نہ کعبے کی، نہ بتخانے کی خاک
عشق کے مذہب میں ہے مسجودِ ویرانے کی خاک

کون کہتا ہے اسے رونا۔ یہ رونا ہی نہیں
آنسوؤں سے شمع کے بھیگی نہ پروانے کی خاک

اور بربادی سے بڑھ جائیگی اس کی آب و تاب
آتشِ سیّال بن جائے گی پیمانے کی خاک

اس میں سوزِ حسن بھی، اس میں گدازِ عشق بھی
جوہروں کا ایک مجموعہ ہے پروانے کی خاک

دیدنی ہے اے منوّر شانِ مرگِ بے خودی
جا کے ہفت افلاک پر پہنچی ہے دیوانے کی خاک

○

دل کے ہر راز سے آگہی ہو گئی
کتنی ہشیار دیوانگی ہو گئی

سر کا ہوش آگیا، در کا ہوش آگیا
ختم کیفیّتِ بندگی ہو گئی

ہائے آسودہ کامی کی بے صبریاں
اور بھی کچھ سوا تشنگی ہو گئی

یوں تو ہر بزم میں شمع ہے سر بکف
اور مدھم اگر روشنی ہو گئی

دل کی ہر بات پر اعتماد آگیا
میری دشمن مری سادگی ہو گئی

دل سے جینے کا ارمان رخصت ہوا
ختم مرنے کی اُمید بھی ہوگئی

کیا ارادہ ہے برقِ جہندہ بتا
کیوں نشیمن میں یہ روشنی ہوگئی



دِل میں جھُلس دینے والی پہلی سی وہ آگ نہیں
شمع ہو یا پروانہ اب اس سے کسی کو لاگ نہیں

میرے سر پہ رکھ کر پاؤں تان چھیڑے بنسی کی تان
کرشن کنہیّا تم ہو اگر کیا میں کالی ناگ نہیں

یہ مانا میرے دل میں ہر دم آگ سی جلتی ہے
راگی مجھ کو کیوں چھیڑیں، کچھ میں دیپک راگ نہیں

پریم کی لو کے اُٹھنے سے دل کی لگی بجھ جاتی ہے
آگ جسے کہتے ہو تم، پانی ہے، وہ آگ نہیں

میرے بھاوؤں کو دیکھو، جھاگ ہی جھاگ سراسر ہیں
میرے من کے ساگر میں، لہر کوئی بے جھاگ نہیں

اب نہ عبیر اڑتا ہے کہیں اب نہ گلال آتا ہے نظر
رنگ ہوا بدرنگ ایسا پھاگ ہی پھر بھی پھاگ نہیں

من کی بھینٹ میں سب کچھ ہے، کچھ تو مول لگے ہیں کا

کیا یہ سُداما کے تندُل[1] کیا یہ بِدُر کا ساگ نہیں

ہے یہ بات اچنبھے کی، کوئی مُنوّر کو دیکھے

دِل سے دُھواں سا اُٹھتا ہے دِل میں بظاہر آگ نہیں

---

[1] تندل بمعنی چاول



لوں کام فکر و غور سے یا برمحل کہوں
ڈوبوں غزل کے رنگ میں جب میں غزل کہوں
پانسے کی جیت ہار کو دوں میں دہن کا نام
پانسے کی جیت ہار کو تقدیر نل کہوں
لیتی ہے ایک حدِّ مقرر میں کروٹیں
ہر سانس کو جبینِ مشیّت کا بَل کہوں
ہونا بھی اک بلا ہے نہ ہونا بھی اک بلا
کیا چیز ہے حیات میں کِس کو اجل کہوں
میرے ہی رنگ و بو سے کھِلی ہے کلی کلی
ہر پھُول کو میں اپنے ہی دل کا کنول کہوں
معصُومیت جمال کی جن میں بھری ملے
کیوں ایسے آنسوؤں کو نہ گنگا کا جل کہوں



بڑھتی ہوئی وحشت کی تاثیر نظر آئی

جس پاؤں میں بھی دیکھا زنجیر نظر آئی

جس حرف کو بھی دیکھا رکھتا تھا جدا معنٰی

بے ربط سی قسمت کی تحریر نظر آئی

ہر گام پہ حائل تھا تخریب کا اندیشہ

دشوار بہت دل کی تعمیر نظر آئی

تھا جرم کسی کا بھی اے دیدۂ شائستہ

لیکن مجھے اپنی ہی تقصیر نظر آئی

کیا حال نے کر ڈالی تہذیب کی یہ حالت

لٹتی ہوئی ماضی کی جاگیر نظر آئی



میں آب و گِل کی حدوں سے ہوں دور محوِ خیال
اب اس جہان کو دُنیا کوئی کہے نہ کہے

تمام عالمِ ہُو ہے، تمام ویرانی
دلِ غریب کو صحرا کوئی کہے نہ کہے

مجھے تو دردِ محبّت سے مل گئی تسکین
مری اجل کو مسیحا کوئی کہے نہ کہے

ہوا ہے خونِ جگر کتنی کاوشوں سے نصیب
اب اس کو غم کا مداوا کوئی کہے نہ کہے

جنُوں کو عقل پہ ترجیح دے رہا ہوں میں
اب اس خیال کو سودا کوئی کہے نہ کہے

بجائے اشک، ہیں سیّال غم کے انگارے
اب اس کو آگ کا دریا کوئی کہے نہ کہے

○

جھکی ہوئی جو گلستاں میں آنکھ سب کی ہے
کلی کلی میں یہ معصومیت غضب کی ہے

پچُھو رہی ہے قیامت کے تیر نس نس میں
وہ اک ادا جو نگاہوں نے منتخب کی ہے

مری نظر سے نہ اپنے جمال کو چھینو
یہی تو شمع مرے جادۂ طلب کی ہے

بتاؤں کیا کہ ہوا میں خرد سے کیوں گمراہ
نہ اپنے ہوش میں تھا میں یہ بات جب کی ہے

اِدھر حیات پریشاں اُدھر اجل مبہوت
دُعا یہ کیا کسی بیمارِ جاں بلب کی ہے؟

مُصیبتیں تو منّور کی ہیں ازل سے رفیق
مُصیبتوں کی منّور نے فکر کب کی ہے



چین سے موت کے آغوش میں پلنے کے لئے
مر مٹے ہم رخِ ہستی کو بدلنے کے لئے

دل کی رفتار بھی کچھ حد سے بڑھی جاتی ہے
پاؤں اٹھے ہیں یہ کس راہ میں چلنے کے لئے

آسمانوں میں بھی ہلچل سی نظر آتی ہے
ہاتھ اٹھائے ہیں جو قسمت کو بدلنے کے لئے

دے اٹھے گا جو یہ شعلہ تو بگڑ جائے گی بات
نہ کرے دل سے تقاضا کوئی جلنے کے لئے

مٹنے پائے نہ مرے ذوقِ خلش کی عظمت
دل میں کانٹا نہ چبھے دل سے نکلنے کے لئے

چاہتے ہیں مری تحریرِ جبیں کی تجدید
جب میں راضی نہیں قسمت کو بدلنے کے لئے

انجمن باعثِ ہنگامۂ محشر ہوگی
چھوڑ دو شمع کو خلوت ہی میں جلنے کے لئے

میں سمجھتا ہوں اسے ننگِ طریقت یا رب
پاؤں مجبور ہوں جب راہ میں چلنے کے لئے



کیسے کہیں ہم تم کو ستمگر نہیں کہتے
کہتے تو ہیں لیکن کبھی کھُل کر نہیں کہتے

پرواز کا ہے حوصلۂ دل سے تعلق
ہم طائرِ بے پر کو بھی بے پر نہیں کہتے

ہے نام کی عظمت کے لئے ظرف بھی درکار
میخانے میں ہر جام کو ساغر نہیں کہتے

اتنی ہے سرے مشرب میں ہے گنجائشِ تاویل
مومن بھی مُنوّر سے مجھے کافر نہیں کہتے

○

پڑھ کے افسانۂ دل کیوں چُپ ہو

کوئی مطلب تو عبارت کرتے

تم کو تردید سے اُلجھن ہوتی

ہم جو اظہارِ محبت کرتے

کفر سے دین کی عظمت بڑھتی

عشق کو جزوِ عبادت کرتے

اور بھی دل کو اذیّت ہوتی

تم سے کیا ذکرِ مصیبت کرتے

تم مخاطب ہو تو کھولی ہے زباں

ہم تو اس کی بھی نہ جرأت کرتے



جمالِ دِل نشیں کی شانِ رعنائی نہیں جاتی
بہ کثرت گو ہیں جلوے پھر بھی یکتائی نہیں جاتی

یہ جتنے ہوش والے ہیں وہی بدنام کرتے ہیں
زیادہ دُور دیوانوں کی رُسوائی نہیں جاتی

اسے میرے ہی غم خانے میں آ کر چین ملتا ہے
کبھی اوروں کے گھر کیوں شامِ تنہائی نہیں جاتی

مسیحا خواہ آئے اور بے پُرسِش چلا جائے
کسی کو چھوڑ کر مُردہ، مسیحائی نہیں جاتی

کبھی ان رخنہ اندازوں سے دل خالی نہیں رہتا
چلی جاتی ہے نادانی تو دانائی نہیں جاتی

زمانہ بیشتر ہے مطمئن اپنے مقدّر سے
منوّرؔ کیوں تمھاری ناشکیبائی نہیں جاتی

○

کوئی اپنا مجھے نہیں سمجھا
کوئی گویا مجھے نہیں سمجھا
دیکھ کر میری زندگی کی روش
کس نے دریا مجھے نہیں سمجھا
میری دیوانگی کی قدر نہ کی
جانِ صحرا مجھے نہیں سمجھا
دیکھ کر آس پاس پھولوں کے
کس نے کانٹا مجھے نہیں سمجھا
بات ایسی ہی کچھ منوّر تھی
اک زمانا مجھے نہیں سمجھا

○

غنچوں کے لب سے تو ہے تبسّم فگن تمام
ہیں اک تری نظر کا شگوفہ چمن تمام

اک دل میں کائناتِ دو عالم سما گئی
اک پھول نے سمیٹ لیا ہے چمن تمام

کیا پڑ گیا ہے شامِ غریباں سے واسطہ
خونِ شفق میں غرق ہے صبحِ وطن تمام

یہ ہے ترا لباس کہ جامہ نسیم کا
گل پیرہن تجھی سے ہیں گل پیرہن تمام

اک پھول کو بھی ہاتھ لگانے کا حق نہیں
ہونے کے واسطے تو ہے اپنا چمن تمام

دیکھے تو کوئی ان کے دِلوں کو ٹٹول کر
بُت ساز بھی ہیں، اپنی جگہ بُت شکن تمام
کھولے تو لاکھ، کھل نہ سکے رنگ و بو کے راز
غنچے چمن میں بن گئے مہرِ دہن تمام



مجھ کو مٹا کے سر بہ گریباں نہیں رہے
اک لمحہ بھی تو آپ پریشاں نہیں رہے
عنواں وہ انقلاب کے عنواں نہیں رہے
طوفاں ہزار اُٹھ کے بھی طوفاں نہیں رہے
وہ پھول جو بہار بداماں نہیں رہے
آئینہ دارِ حسنِ گلستاں نہیں رہے
دیوانگی میں ہوش کے ساماں نہیں رہے
حُرمت شناس جیب و گریباں نہیں رہے
میں نے مزاجِ طوق و سلاسل بدل دیا
زنداں مری نگاہ میں زنداں نہیں رہے
دستور یہ کہاں کا ہے اے موسمِ بہار
غنچے کھلے تو زیبِ گلستاں نہیں رہے

ہر شرط ہم نے تا دمِ آخر نباہ دی
صد شکر زندگی سے پشیماں نہیں رہے
ان کا تو ہر لحاظ سے سانچہ بدل گیا
انساں کسی بھی شکل سے انساں نہیں رہے



مسلسل جزر و مد سے منتشر ہے زندگی میری
ہلاکِ ناشکیبائی ہو کیوں آسودگی میری

دلیلِ فتح مندی ہے سرِ تسلیم خم کرنا
غرورِ خواجگی کو توڑ دے گی بندگی میری

مری کوتاہیوں پر اب نظر اٹھے تو کیا اُٹھے
نقابِ رُخ کسی کا بن گئی شرمندگی میری

مری فطرت سے کیوں کج باطنوں کو بدگمانی ہو
ہزاروں آئینوں میں منعکس ہے زندگی میری

مرے جذبات میں ہیں آندھیوں کے سینکڑوں طوفاں
بجھا دیتی ہے دل دُنیا کا بھی افسردگی میری

جُھلس کر دورِ نو کی روشنی سے کھوؤں کیوں آنکھیں
مرے حق میں ہے اک نعمت منّور تیرگی میری



جنوں کے راز، دیوانہ کہے گا، تم بھی سُن لینا
دلِ وحشی کا افسانہ کہے گا، تم بھی سُن لینا

وہ دل جس سے مٹائے دے رہے ہو یاد تم اپنی
زمانہ اس کو ویرانہ کہے گا، تم بھی سُن لینا

ہوا تفتیدہ کیونکر شمعِ کشتہ کے اِشارے پر
رموزِ عشق پروانہ کہے گا، تم بھی سُن لینا

بڑے اسرار اس سے میکدے کے منکشف ہونگے
بڑے اسرار پیمانہ کہے گا، تم بھی سُن لینا

دلِ وحشت زدہ مجبور ہوکر ذرّے ذرّے سے
محبت کا عجب افسانہ کہے گا، تم بھی سُن لینا

وہی ساقی جو میرے ظرف پر کل طنز کرتا تھا
مری آنکھوں کو پیمانہ کہے گا، تم بھی سُن لینا



وہ جو سخن طراز ہو خود مرے دم پہ آ بنے
جس سے سوال میں کروں اس سے جواب کیا بنے

مجھ کو کسی سے کیا غرض کیوں میں کہیں ذلیل ہوں
جو مری آرزو نہ ہو غیر کا مُدّعا بنے

عرش کو یوں بنائے فرش، فرش کو یوں بنائے عرش
گردِ رہِ وفا بنے، دل تری خاکِ پا بنے

کاش تم اس کا فیصلہ میرے ہی دل پہ چھوڑ دو
کس کی میں بندگی کروں، کون مرا خدا بنے

جنبشِ لب دمِ طلب جنبشِ رائیگاں نہ ہو
جس میں ہو جذبِ دل شریک حرف وہی دُعا بنے

مل کے رہے گا خود بخود منزلِ شوق کا سراغ
کوئی نہ راستہ بتائے کوئی نہ رہ نما بنے

کیوں نہ بلائیں لیجئے حسنِ ستم ظریف کی
آپ ہی آئینہ دکھائے آپ ہی خود نما بنے

دل پہ تعلقات کا رنگ چڑھے کچھ اس طرح
آپ ہی خود سے غیر ہو آپ ہی آشنا بنے

مجھ کو منوّر اس قدر تلخیٔ زیست ہے پسند
ہو بھی جو قسمتِ رسا، قسمتِ نارسا بنے



ہوا ہے کون ہلاکِ ادائے بیگانہ

کسی کی چشمِ پشیماں سے پوچھ تو لیتے

سپردگی میں نہیں گو سوال کچھ جائز

مآلِ دل غمِ جاناں سے پوچھ تو لیتے

یہ کس کی ضد سے بکھرنے پہ ہو گئی مجبور

تم اپنی زلفِ پریشاں سے پوچھ تو لیتے

ہے اختیار تمھیں لاکھ گل کھلانے کا

مگر بہارِ گلستاں سے پوچھ تو لیتے

خیال بھی ہے مُنوّرؔ پہ رحم کھانے کا

یہ بات گردشِ دوراں سے پوچھ تو لیتے

○

برنگِ بادِ صبا گُل کِھلائے ہیں کیا کیا
مرے ہی دل نے ستم مجھ پہ ڈھائے ہیں کیا کیا

طرح طرح سے کیا ہے توقعات کا خون
مری نگاہ نے منظر دکھائے ہیں کیا کیا

سمجھ کے کچھ جسے دیکھا وہ اور کچھ نِکلا
فریب اپنی ہی آنکھوں نے کھائے ہیں کیا کیا

مرے خیال سے پیدا ہیں گلستاں کتنے
مرے قیاس نے صحرا بنائے ہیں کیا کیا

روش روش پہ اُٹھانا ہے قید کی لذّت
نظر نے دام چمن میں بچھائے ہیں کیا کیا

کوئی غریب کے اس حوصلے کی داد تو دے
ذرا سی جان نے صدمے اُٹھائے ہیں کیا کیا



جو موج بھی ہے، اپنی حد سے باہر ہی نکلتی جاتی ہے
طوفان کی خواہش دریا کے آغوش میں پلتی جاتی ہے
چارہ ہی نہیں کچھ، رُخ اپنا تقدیر بدلتی جاتی ہے
کیا دھوپ کی ہم اُمید کریں، جب چھاؤں ہی ڈھلتی جاتی ہے
دُنیا کے تغیّر کا کوئی دنیا پہ اثر کیا خاک پڑے
پردہ تو ایک ہی رہتا ہے تصویر بدلتی جاتی ہے

کیا جانے کس سوال کا پایا ہے کیا جواب
آنسو بھرے ہیں دیدۂ امیدوار میں

کیا فکرِ کیف و کم سے مُنوّر مجھے غرض
اک مست ہوں میں خم کدۂ روزگار میں

○

بڑے عجیب مناظر نظر سے گزرے ہیں
جب اہلِ ہوش تری رہگزر سے گزرے ہیں

تمام گرد نظر آ رہی ہے دامن پر
حضور جادۂ شمس و قمر سے گزرے ہیں

یہ راہ مُڑ کے گئی ہوگی میکدے کی طرف
یہ جانتے ہیں، کبھی ہم ادھر سے گزرے ہیں

ہمیں بھی اُن پہ ذرا تبصرے کا موقع دو
جو فیصلے نگۂ دادگر سے گزرے ہیں

خرد کے جادۂ پُر پیچ سے نہیں واقف
مگر جنوں کی رہِ معتبر سے گزرے ہیں



پسِ تشہیرِ آئینِ وفا بدلوں تو کیا بدلوں
اب اِس منزل پہ آکر راستا بدلوں تو کیا بدلوں

تلاطم سے مفر کی جو بھی صورت ہو وہ صورت ہے
سفینے کے لئے اب ناخدا بدلوں تو کیا بدلوں

کچھ اپنی عمر کا ہے پاس، کچھ تیری بزرگی کا
میں اس منصب سے تجھ کو اے خدا بدلوں تو کیا بدلوں

دلِ بیمار اس منزل میں ہے اب سوچتا ہوں میں
دوا بدلوں تو کیوں بدلوں دوا بدلوں تو کیا بدلوں

کہاں سے لائے گا، کوئی مرے احساس کی ندرت
کسی سے میں دلِ دردآشنا بدلوں تو کیا بدلوں

نہیں اچھا نگاہِ دہر میں نامعتبر ہونا
بہ تنگِ گل کبھی اپنی قبا بدلوں تو کیا بدلوں

○

نظر نظر کی تمنّا حسین ہے کتنی
یہ دیکھنا ہے کہ دُنیا حسین ہے کتنی
نظر فریب ہیں کفرِ جمیل کے انداز
شبیہہِ دیر و کلیسا حسین ہے کتنی
لہُو رگوں میں بہ شکلِ خمارِ رقصاں ہے
ادائے ساغر و مینا حسین ہے کتنی
اس انتظار میں لیتا ہے کروٹیں اِمروز
امیدِ آمدِ فردا حسین ہے کتنی
تاثّرات کی رادھا کا عکس پڑنے سے
تخیّلات کی جمنا حسین ہے کتنی
مری نگاہ کی مجنوں نے پرورش کی ہے
مرے خیال کی لیلےٰ حسین ہے کتنی

ہوئی ہے کس کو ہم آغوشیِ دوام نصیب
یہ شکلِ ساحل و دریا حسین ہے کتنی

بہت جمیل منوّرؔ کی فکرِ تازہ ہے
غزل یہ آپ نے دیکھا حسین ہے کتنی

○

شاعری وحی سے، الہام سے آگے نہ بڑھی
اک قدم بھی روشِ عام سے آگے نہ بڑھی
کارفرمائیِ معمارِ تخیّل کیا ہے
کوئی تعمیر در و بام سے آگے نہ بڑھی
وقت کی رو تھی بہر حال حدوں کی پابند
اک قدم بھی سحر و شام سے آگے نہ بڑھی
انقلاب آئے، بہت آئے، ہمیشہ آئے
پھر بھی دُنیا روشِ عام سے آگے نہ بڑھی
صرف مرغانِ گرفتار پہ ڈھانا تھا ستم
ایک بجلی بھی رگِ دام سے آگے نہ بڑھی

داستاں جب بھی دلِ زار نے اپنی چھیڑی
ذکرِ بے مہریِ ایّام سے آگے نہ بڑھی

رہ گیا کعبۂ دیں اس سے منوّر محروم
دلبری حلقۂ اصنام سے آگے نہ بڑھی



چمن کی اس ادا کو جاں ستاں کہنا ہی پڑتا ہے
کلی کو پھول بننے پر جواں کہنا ہی پڑتا ہے

حدِ انکار اک منزل پہ آ کر ٹوٹ جاتی ہے
نہیں کے بعد مجبوری سے ہاں کہنا ہی پڑتا ہے

محبّت میں بدل جاتا ہے اک اک لفظ کا مطلب
دلِ ناکام کو بھی کامراں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ ظرفِ مختصر اور اس پہ دل میں اتنی رنگینی
ذرا سی پنکھڑی کو گلستاں کہنا ہی پڑتا ہے

کچھ اس انداز سے تم روح اس میں پھونک دیتے ہو
جہانِ عارضی کو جاوداں کہنا ہی پڑتا ہے



فکرِ دیں کی، غمِ فردا کی ضرورت کیا تھی؟
تہہ بہ تہہ دامِ تمنا کی ضرورت کیا تھی؟

کیا کوئی ہرج تھا نیرنگ طرازی کے بغیر
کہیں گلشن کہیں صحرا کی ضرورت کیا تھی؟

بے کرانی کو نہ ہونا تھا گنہگارِ حدود
اتنی پابندیِ دریا کی ضرورت کیا تھی؟

ملّتیں یوں نہ اُڑاتیں کبھی ایماں کا مذاق
دیر و کعبہ کی کلیسا کی ضرورت کیا تھی؟

کیا بغیر اس کے تھی تزئینِ جنوں ناممکن
کاکل آرائیِ لیلےٰ کی ضرورت کیا تھی؟

غلطی سی غلطی اور پھر اس کا یہ جواز
میں تو کہتا ہوں کہ دُنیا کی ضرورت کیا تھی؟

○

کہاں کی بے خودی ہے حدِ ہستی سے گزر جانا
شکستِ رنگِ میخانہ ہے پیمانے کا بھر جانا

نسیمِ صبح آکر رنگِ تازہ اس میں بھر جانا
چمن کا خون ہے پھولوں کے چہرے کا اُتر جانا

ترقی کی بہت دریا کی موجوں نے تلاطم میں
نہ آیا پھر بھی پانی کو مرے سر سے گزر جانا

رہیں محتاط غنچے جب بھی اپنی مٹھیاں کھولیں
زوالِ گلستاں ہے پتی پتی کا بکھر جانا

کھٹکتا ہے بہت جبریل و شاہیں کی نگاہوں میں
مرا بے بال و پر ہونے پہ بھی پرواز کر جانا

یہ مانا چھن کے گردوں سے یہ دولت ہاتھ آئی ہے
مبارک موتیوں سے منھ مگر پھولوں کا بھر جانا

جو بوسیدہ نظامِ زندگی ہے ختم ہو جائے
بجا ہے جسم سے ملبوسِ کہنہ کا اُتر جانا

○

نگاہِ دِل نشیں کی بے رُخی دیکھی نہیں جاتی
جمالِ نازنیں میں یہ کمی دیکھی نہیں جاتی

قیامت ہے کہ اک پردہ بھی اب جنبش نہیں کرتا
یہ خاموشیِ سازِ زندگی دیکھی نہیں جاتی

چمن والوں سے کہہ دو ڈال لیں پردہ نگاہوں پر
ہنسی پھُولوں کی یوں اُڑتی ہوئی دیکھی نہیں جاتی

نظر آئے کہاں سے دِل میں احساسات کا شعلہ
جو بجھ جاتی ہے پھر وہ روشنی دیکھی نہیں جاتی

حجابِ ناز کے ہر چاک میں رنگِ قیامت ہے
مری آنکھوں سے یہ بے پردگی دیکھی نہیں جاتی

یہ آنکھیں لے کے واپس دوسری آنکھیں ہمیں دیدو
ان آنکھوں سے تمہاری روشنی دیکھی نہیں جاتی

ضرور اس خاک میں پنہاں کوئی برگشتہ دل ہوگا
غبارِ راہ کی سرگشتگی دیکھی نہیں جاتی

قیامت ہے اس انگارے کا بجھ کر راکھ ہو جانا
دلِ ناکام کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی

جب اجزا منتشر ہوتے ہیں آنکھیں پھیر لیتا ہوں
کہ یہ شکلِ مآلِ زندگی دیکھی نہیں جاتی

منوّرؔ کس طرح دیکھیں پگھلنا شمعِ سوزاں کا
خود اپنی عمر بھی ڈھلتی ہوئی دیکھی نہیں جاتی

○

اسی نے مجھ کو بھی دریا کی زندگی دی ہے
جس اضطراب نے موجوں کو بے کلی دی ہے

مرے چراغ نے بجھ بجھ کے روشنی دی ہے
مجھے حیات نے مٹ مٹ کے زندگی دی ہے

نعیم کیا ہے یہ اندھیر تیری بخشش کا
جو ظلمتوں سے گھری ہے وہ آگہی دی ہے

وداعِ ہوش ہے حد سے مرا گزر جانا
خودی نے خود مجھے تعلیمِ بے خودی دی ہے

کریں تو خاک کریں ذکرِ ماورائے حیات
غمِ حیات نے فرصت ہمیں کبھی دی ہے

سلوکِ برق کے قربان آشیاں والے
تباہ ہو کے بھی شعلوں نے روشنی دی ہے

عجب مذاق مرے ساتھ ہے یہ فطرت کا
ستم ظریف نے کیوں اتنی سادگی دی ہے
بہار کا یہ تبسم ہے موت پھولوں کی
کرے گی خون اسی کا جسے ہنسی دی ہے

عجب مذاق مرے ساتھ ہے یہ فطرت کا
ستم ظریف نے کیوں اتنی سادگی دی ہے
بہار کا یہ تبسّم ہے موت پھولوں کی
کرے گی خون اسی کا جسے ہنسی دی ہے

Diligam
tr. lisram uprseh